تحریک رجوع الی القرآن کے فروغ میں مرکزی انجمن خدام القرآن کا حصہ

مرکزی انجمن کے ۲۶ ویں سالانہ اجلاس کے موقع پر صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد کا اختتامی خطاب

خطبہ مسنونہ 'تلاوتِ آیات اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد فرمایا :

محترم وابستگانِ انجمن و دیگر معزز حاضرین! انجمن کا سالانہ اجلاس اصل میں ضابطے کی کارروائی کے تحت منعقد ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں کسی دعوتی یا تبلیغی تقریر کا موقع ہوتا ہے نہ ہی کسی علمی یا تحقیقی بات کا۔ لیکن چونکہ یہ ایک رسم ہے کہ اختتام پر کچھ نہ کچھ کلمات ضرور کہے جائیں اس لئے سب سے پہلے میں اس اجلاس کے آغاز میں جو سورۃ الحشر کے آخری رکوع کی آیات تلاوت ہوئیں ان پر کچھ گفتگو کرنا چاہوں گا' کیونکہ یہ قرآن مجید کے بڑے نمایاں مقامات میں سے ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا سب سے بڑا گلدستہ وارد ہوا ہے' ورنہ اکثر آیات میں دو دو اسماء یا صفات کا ذکر ہوتا ہے' صرف دو مقامات (سورۃ الحدید اور سورۃ الجمعہ) ایسے ہیں جہاں چار اسماء آئے ہیں' لیکن اس مقام پر سولہ اسمائے حسنیٰ ایک گلدستے کی شکل میں اکٹھے آئے ہیں۔

ایک خاص نکتے کی طرف میرا ذہن متوجہ ہوا ہے کہ اس رکوع میں سات آیات ہیں جن میں سے پہلی تین آیات کا تعلق انسانوں سے ہے' جہاں انسان کو تقویٰ اختیار کرنے اور اپنی حقیقت پہچاننے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے ع "اپنی خودی پہچان' او غافل انسان!" کیونکہ انسان صرف جسم اور جان ہی کا مرکب نہیں ہے بلکہ کوئی اور معنوی حقیقت بھی اس میں پنہاں ہے۔ آخری تین آیات کا تعلق ذات باری تعالیٰ سے ہے ـــــ اور ان دونوں کو ملانے والی چیز قرآن مجید ہے جس کا ذکر اس رکوع کی وسطی یعنی چوتھی آیت میں آیا ہے : ﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ ﴾ یہ وہ آیت ہے کہ

جس کے بارے میں' میں کہا کرتا ہوں کہ اس آیۂ مبارکہ میں اللہ کے کلام کی عظمت فی نفسہٖ بیان کی گئی ہے۔ ایک ہوتی ہے کسی شے کی افادیت اور ایک اس کی اپنی جگہ پر عظمت ہوتی ہے۔ "کلام اللہ" کی افادیت پر تو بہت سی آیات ہیں کہ یہ کس کس پہلو سے مفید ہے اور یہ کس کس پہلو سے تبدیلی لاتا ہے۔ لیکن فی نفسہٖ اس کی عظمت کیا ہے' اس پر پورے قرآن مجید میں یہ واحد آیت ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے ادراک و شعور سے ماوراء ہے اسی طرح عظمت قرآنی کا فہم بھی انسانی فہم سے بالاتر اور ماوراء ہے' اسی لئے اس آیت میں قرآن کی عظمت کو تمثیلی انداز میں سمجھایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا: ﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ جو حقائق انسانی ذہن کی گرفت سے ماوراء ہوں اور اس کا کچھ نہ کچھ اجمالی سا تصور دینا بھی انسانوں کے لئے ضروری ہو' وہاں قرآن تمثیلات کا پیرایہ استعمال کرتا ہے کہ "مالا یدرک کله لایترک کله" کے اصول کے تحت بات اگر پوری سمجھ میں نہیں آسکتی تو ساری کو ترک بھی نہ کیا جائے۔ تاکہ ان حقائق کا کچھ ادراک تو حاصل ہو سکے۔ اسی طرح قرآن کی عظمت کو بھی اس آیت میں تمثیل کے ذریعے سمجھایا گیا ہے کہ "اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اُتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کی خشیت سے"۔

اس کو بھی اکثر و بیشتر لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ شاید یہ کوئی استعارے اور محاورے کے انداز میں بات کہہ دی گئی ہے۔ لیکن یہ بات تب کہی جا سکتی تھی اگر قرآن میں وہ واقعہ موجود نہ ہوتا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے درخواست کی تھی ﴿ رَبِّ اَرِنِىْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ﴾ کہ پروردگار مکالمہ سے تو کئی بار مشرف ہو چکا ہوں لیکن اب میرے اندر تیری دید اور تیرے دیدار کی خواہش رو کے نہیں رکتی۔ جس پر جواب ملا: ﴿ لَنْ تَرٰىنِىْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِىْ ﴾ "تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے' لیکن اس پہاڑ کو دیکھو (اس پر ہم اپنی تجلی ڈالیں گے) اگر وہ (اسے سہار گیا اور) اپنے مقام پر کھڑا رہ گیا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے"۔ ﴿ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ﴾ یہ محض کوئی پیرایۂ بیان نہیں ہے' کوئی استعارہ نہیں ہے "جب اس کے رب نے اپنی تجلی اس پہاڑ پر ڈالی تو وہ پھٹ گیا اور ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ (اس بالواسطہ تجلی باری تعالیٰ کے مشاہدے سے) بے ہوش ہو کر گر پڑے"۔ چنانچہ جو عظمت "تجلی ذاتِ

باری تعالیٰ" کی ہے وہی عظمت قرآن حکیم کی بھی ہے۔

جیسا کہ میرا موقف ہے کہ علامہ اقبال عظمت قرآن کے بہت بڑے عارف تھے' بلکہ دورِ حاضر کے بارے میں تو میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ علامہ اقبال سے بڑھ کر قرآن کی عظمت کا ادراک کسی کو حاصل نہیں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مفسرین' لغت ہائے حجازی کے قارون اور روایات کے حافظ تو بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن عظمت قرآن کا ادراک اور اس کا انکشاف علامہ اقبال پر جن مختلف پہلوؤں سے ہوا ہے میرے سامنے اس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔ چنانچہ اس مضمون کو اقبال نے بڑی خوبصورتی سے انتہائی نازک پیرائے میں بیان کیا ہے ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

"صاف ہی کہہ دوں جو میرے دل میں چھپا ہوا ہے کہ اس قرآن کو کوئی کتاب نہ سمجھ بیٹھنا' یہ کچھ اور ہی شے ہے"۔

ایک اور شعر میں قرآن اور ذات باری تعالیٰ کے تعلق کو یوں واضح کیا ہے ؎

مثل حق پنہاں و ہم پیداست ایں
زندہ و پائندہ و گویاست ایں

"ذاتِ باری تعالیٰ کی مانند یہ قرآن ظاہر بھی ہے اور پنہاں بھی ہے۔ یہ جیتی جاگتی بولتی ہوئی کتاب ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی ہے"۔

یعنی ایک اعتبار سے یہ انتہائی ظاہر ہے اور اس پر تذکر کرنا بہت آسان ہے' اس سے نصیحت اخذ کرنا نہایت سہل ہے۔ اس کے لئے صرف اتنی عربی ضروری ہے کہ درمیان میں ترجمے کا حجاب نہ رہے' لیکن اس کی گہرائیوں اور پنہائیوں کا اندازہ تو انسان کر ہی نہیں سکتا۔ ناممکن ہے کہ کوئی اس کی تہہ تک پہنچ سکے' اس کی کوئی تہہ ہے ہی نہیں۔ اس تک پہنچنے کا کوئی امکان ہی نہیں۔ کیونکہ قرآن "کلام ربانی" ہونے کے اعتبار سے "صفت الٰہی" ہے اور اللہ کی ساری صفات اس قرآن میں ہیں۔

اس مقام پر ذہن اس طرف منتقل ہوا ہے کہ الحمدللہ جو کام ہم نے شروع کیا تھا وہ اب عربی زبان کی کلاسز اور فہم قرآن کے کورسز کی شکل میں اللہ کے فضل و کرم سے

ہمارے معاشرے میں عام ہو رہا ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے اور معاملہ امید افزا ہے۔ ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں!

ایک زمانہ تھا کہ اس شہرلاہور میں درس قرآن کا کوئی حلقہ موجود نہیں تھا' صرف غلام احمد پرویز کا مختصر سا حلقہ درس ہوا کرتا تھا لیکن وہ بھی امت کے سوادِ اعظم کے تصورات سے ہٹ کر تھا۔ آج بڑے پیمانے پر لوگ آگے آئے ہیں۔ اور اس سمت میں جو بھی کام آگے بڑھ رہا ہے اس میں ہمیں بھی اجر و ثواب ملے گا' کیونکہ اللہ کے ہاں تو سپر کمپیوٹرز ہیں۔ وہاں سب حساب کتاب موجود ہے کہ کس کام کو کس نے شروع کیا تھا۔

آج میں جس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ صرف عربی سیکھنا اور قرآن کا ترجمہ سمجھ لینا ہی مقصود نہیں ہے۔ اگرچہ اس سے بعض چیزیں حاصل ہو جائیں گی اور وہ بھی بہت بڑا نفع ہے' کیونکہ اس سے جاہلیت قدیمہ کے مشرکانہ اوہام کی جڑ کٹ جائے گی اور فرقہ پرستی کی تلخی بھی نہ صرف کم ہو گی بلکہ ختم ہو گی' لیکن یہ اس دور کے مسئلے کا اصل حل نہیں ہے۔ اور میں حیران ہوں کہ اس اعتبار سے علامہ اقبال کی نگاہ کہاں تک پہنچی ہے کہ ؎

تُو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الٰہ اِلاّ
لغت غریب جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

یعنی یہ کہ عربی زبان جاننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ سارے کے سارے عرب جن کے سامنے حضور قرآن پیش کر رہے تھے وہ عربی جاننے والے ہی تو تھے۔ اور آج جو عرب دنیا ہے اس کی اکثر و بیشتر صورت حال یہ ہے کہ عربی ان کی مادری زبان ہے' لیکن قرآن مجید کے عربی زبان میں ہونے کے باوجود قرآن کے اور ان لوگوں کے ذہنوں کے مابین حجابات طاری ہو گئے ہیں۔ یہ حجاباتِ علمیہ ہیں' یعنی غلط نظریات' غلط اقدار' غلط سائنسی تصورات نے درمیان میں آکر جھاڑ جھنکاڑ کھڑا کر دیا ہے' جس کے باعث قرآن مجید کے ساتھ ذہن کی ہم آہنگی نہیں ہو پاتی اور جب تک ذہن ہی کی ہم آہنگی نہیں ہو گی تو دل بیچارہ کیا کرے گا۔ کیونکہ دل تک کوئی بات ذہن کے Barrier سے گزر کر پہنچتی ہے۔ البتہ عوام الناس

سادہ لوح ہوتے ہیں' انہیں ان افکارِ علمیہ سے کوئی تعلق' کوئی دلچسپی نہیں ہوتی' ان کے دل clean slate کی مانند صاف ہوتے ہیں' اس لئے آپ آسانی سے ان کے قلوب تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں۔ لیکن وہ کسی معاشرے کے اصل فیصلہ کن عنصر نہیں ہیں' وہ تو معاشرے کے ہاتھ پاؤں ہیں' جو صرف بھاگ دوڑ کرسکتے ہیں' جبکہ ان کو کنٹرول کرنے والی تو ذہین اقلیت (Brain Trust) ہوتی ہے۔ یہ حجاباتِ علمیہ اس ذہین اقلیت کے راستے میں حائل ہیں۔ آج کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کا علاج کیا جائے۔

جہاں تک معاملہ سائنس اور مذہب کا ہے اس میں تدریجاً کام ہو رہا ہے۔ میرے علم کی حد تک برعظیم پاک وہند میں اس کام کو شروع کرنے والے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم ہیں جنہوں نے علامہ اقبال کے فکر کے تحت قرآن اور سائنس کو ایک دوسرے کے قریب لاکر ان میں باہمی ربط قائم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس ضمن میں ہمارا بھی حصہ ہے' لیکن اکثر و بیشتر چیزیں بعد میں جا کر نمایاں ہوتی ہیں' زندگی میں کسی شخص کا contribution نمایاں نہیں ہوتا۔ لیکن میں مطمئن ہوں کہ مابعد الطبیعیات کے جو اعلیٰ ترین سطح کے مسائل ہیں اور پھر سائنس کے حوالے سے کہ اس کائنات کا genesis کیا ہے؟ تخلیق کائنات کے نظریات کیا ہیں؟ یہ Big Bang کیا ہے اور Big Crunch کیا ہوگا؟ اسی طرح روح کیا ہے اور ملائکہ' ارواح انسانی اور وحی کی حقیقت کیا ہے؟ ان مسائل پر میں سمجھتا ہوں کہ الحمدللہ ہم نے اتنا کام کرلیا ہے کہ میں اپنی جگہ بالکل مطمئن ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک سالہ کورس میں جو ایم ایس سی' ڈاکٹرز' انجینئرز اور پی ایچ ڈی حضرات آتے ہیں ان میں سے آج تک یہاں سے کوئی اشکال لے کر نہیں گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بات پوری طرح واضح ہے اور ان مسائل کی جو تشریح قرآن وحدیث کی روشنی میں اللہ نے ہم سے کرائی ہے اس پر علمی سطح پر اطمینان کی کیفیت ہے۔ البتہ خاص فلسفے اور یعنی عمرانی علوم (Social Sciences) کے میدان میں میری کوئی پہنچ نہیں ہے۔ لیکن ان معاملات کے لئے بھی الحمدللہ ہمارا ایک حلقہ وجود میں آ گیا ہے۔ امریکہ میں ہمارے نوجوان رفیق باسط بلال نے Institute of Quranic Wisdom کے نام سے ایک حلقہ پیدا کرلیا ہے جس کے تحت "Event Horizon" کے نام سے ایک پرچہ بھی شائع ہو رہا ہے اور اس کے

ذریعے وہاں کی اونچی سطح کے مفکرین تک ہمارا فکر تیزی کے ساتھ پہنچ رہا ہے۔ باسط بلال نے میرے ایک کتابچے "عظمت صوم" کا ترجمہ کرکے Event Horizon میں شائع کیا ہے' جس میں یہ موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں کہ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا ایک مادی اور حیوانی وجود ہے اور ایک روحانی وجود ہے۔ الحمد للہ اس نظریے کو ان حلقوں میں بڑی پذیرائی حاصل ہو رہی ہے' کیونکہ ان کے لئے تو یہ بالکل نئی باتیں ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں کہ جن کی وجہ سے مذہب اور سائنس میں تقسیم (dichotomy) ہو گئی ہے۔ یعنی ایک طرف نظر آتا ہے کہ عقیدہ اور مذہب بالکل علیحدہ شے ہے جبکہ دوسری طرف سائنس کوئی علیحدہ شے ہے اور ان کے مابین کوئی پل قائم کرنا ممکن ہی نہیں۔ الحمد للہ ہم نے سائنسی حقائق اور قرآنی حقائق کی دوری کو ختم کر دیا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے ہمارے مفکرین نے ان مسائل سے صرف نظر کیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے نظریہ ارتقاء کے بارے میں مولانا مودودی مرحوم کی تشریح کے بارے میں ایک جملہ کہا ہے "Its a positive disservice to the cause of Islam" اس لئے کہ خالصتاً dogmatic انداز اختیار کرکے اتنے بڑے نظریے کے اوپر صرف پھبتیاں چست کرکے کام چلا لینا ٹھیک نہیں ہے۔

اس کے ساتھ جو میں یہ کہتا ہوں کہ اس ارض پاکستان سے ہی اصل اسلام کا احیاء ہونا ہے تو اصل اسلام سے مراد موجودہ دور کا اسلام ہے جو اس دور کے تقاضوں اور روحِ عصر سے ہم آہنگ ہو۔ کیونکہ ایران میں جو اسلام آیا ہے وہ اس دور کا اسلام نہیں ہے' وہ آج سے کئی صدیوں پہلے کا ملائی نظام ہے۔ اسی طرح افغانستان میں جو اسلامی نظام آ رہا ہے وہ بھی درحقیقت کئی صدیوں پہلے کا فقہی اسلام ہے۔ اس دور کے مثالی اسلام کے لئے اللہ نے یہی سرزمین منتخب کی ہے۔ الحمد للہ اس کی طرف پیش قدمی ہو رہی ہے' چاہے وہ چیونٹی کی چال سے ہو رہی ہے' لیکن ہم ادھر ہی جا رہے ہیں۔ اس کے میں جو شواہد پیش کرتا ہوں ان میں اس کو بھی شامل کر لیجئے کہ "سائنس اور قرآن" اور "عقیدہ اور ایمان" کو جوڑنے کے عمل کو الحمد للہ اس سرزمین میں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی خدمت اللہ نے ہم سے لی ہے اور جہاں تک عمرانی علوم کے حوالے سے فکری تعلق ہے الحمد للہ اس کی داغ بیل بھی پڑ چکی ہے۔

آج سے چھ سال قبل میں نے تقریر کی تھی' اس کے حوالے سے میں چاہتا ہوں کہ اس مقام پر دو نکات کا تذکرہ کر دوں۔ ان دو چیزوں کو قرآن نے بیان کیا ہے۔ سورۃ الصف میں ارشاد ربانی ہے : ﴿ یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ﴾ اور اگلی آیت میں آتا ہے : ﴿ ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ﴾ ایک ہے کہ "اتمامِ نور" کہ اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا۔ وہ تو حضور کے زمانے میں ہو گیا۔ یعنی قرآن کے ذریعے اتمامِ نعمت ہدایت کر دیا گیا۔ دوسرا ہے "اظہار دین الحق" یعنی دین کو غالب کرنا۔ دونوں آیات کے آخر میں ہے کہ خواہ یہ کفار اور مشرکین کو کتنا ہی ناگوار محسوس ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کے مابین کوئی بہت اہم منطقی ربط و تعلق ہے' اور الحمد للہ ہم نے اپنی دعوت و تحریک کے یہی دو پہیے قرار دیئے ہیں۔ ایک دعوت رجوع الی القرآن' کیونکہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کا اتمام ہو چکا' اب تو ہمیں اس کا افشاء کرنا ہے' جس کی حدیث میں بھی ترغیب دی گئی ہے کہ ((وَافْشُوْہُ)) "اسے عام کرو' پھیلاؤ" اور ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ)) "تم میں سے بہترین وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور اسے دوسروں کو سکھایا"۔ قرآن مکمل اور کامل ہے اور اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لے لیا ہے' اب صرف اس کا افشاء و اعلان ہے' اس کی تعلیم ہے اور فرمان نبویؐ ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً)) کے تحت اس کو پھیلانا ہے' اس کی تبلیغ کرنی ہے۔ اس کام کے لئے انجمن خدام القرآن قائم کی گئی جو درحقیقت گاڑی کا ایک پہیہ ہے' لیکن اس کے برابر کا لازمی پہیہ "اظہار دین الحق علی الدین کلہ" کی جدوجہد ہے۔ یہ دونوں پہیے اگر ساتھ نہیں ہیں تو پھر یہ معاملہ نتیجہ خیز نہیں ہے۔

اس ضمن میں بھی ہمیں علامہ اقبال کے ساتھ دو نسبتیں حاصل ہیں' ایک یہ کہ انہوں نے دارالاسلام (پٹھانکوٹ) بنوایا' چاہے وہ اس نہج پر نہیں چل سکا' لیکن اس کی کوئی عملی شکل قائم ہوئی ہے تو وہ قرآن اکیڈمی کی صورت میں ہوئی ہے۔ یعنی علامہ اقبال نے ۳۷ء میں جس ضرورت کا اظہار فرمایا ۷۷ء میں اس ادارے کا آغاز ہمارے ہاتھوں قرآن اکیڈمی کی صورت میں ہوا۔ اور یہاں سے سینکڑوں گریجویٹس' پوسٹ گریجویٹس' Ph.D. حضرات اسلام کا صحیح فکر لے کر گئے ہیں۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال کے ذہن میں

دوسرا نقشہ بھی تھا' اگرچہ اس سلسلے میں وہ کوئی اقدام نہیں کرسکے تھے لیکن اب وہ راز کھل کر سامنے آگیا ہے' جسے ہم نے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی کتاب سے لے کر "علامہ اقبال کی آخری خواہش" کے نام سے ایک کتابچہ کی صورت میں شائع کردیا ہے کہ وہ اقامت دین کے لئے بیعت کی بنیاد پر "جمعیت شبان المسلمین ہند" کے نام سے ایک تنظیم قائم کرنا چاہتے تھے' جس میں سمع و طاعت اور دین کی پابندی لازمی تھی۔ چنانچہ انہی بنیادوں پر ہم نے تنظیم اسلامی قائم کی ہے جس کا مقصد "اقامت دین" ہے اور جو گاڑی کا دوسرا پہیہ ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد صرف قرآن کی دعوت اور تبلیغ ہی نہیں تھا' بلکہ دین کو قائم کرنا تھا اور آج سے چودہ سو برس قبل رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں جو انقلاب عظیم برپا ہوا ہے اس کا آلہ یہی قرآن تھا۔ قرآن کے ذریعے تذکیر اور تبشیر اپنی جگہ پر ہے' لیکن اس کا اصل مقصد انقلاب برپا کرنا ہے ؎

اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتاب زندۂ

تاہم اس کتاب کی خدمت کی جو توفیق بھی آپ کو یا مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہے اس پر ہم سب کو شکر ادا کرنا چاہئے اور اس کے لئے ع "ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں" کے مصداق انفاق' محنت و مشقت اور جذبے میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جانا چاہئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بیعت کی مسنون بنیاد پر قائم جماعت میں شامل ہو کر اقامت دین کی ذمہ داری کو پورا کرنے کی طرف بھی توجہ کرنی چاہئے۔ یہ بات ہمارے تجربے میں رہی ہے کہ انجمنوں کے انتخابات ہوتے ہیں تو اس میں لوگوں کی آستینیں چڑھی ہوئی ہوتی ہیں' مقابلے ہوتے ہیں' لیکن اللہ کا فضل ہے کہ ہماری انجمن میں کبھی ایسی نوبت نہیں آئی۔ یہ زمین و آسمان کا جو فرق ہے' اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ہم نے انجمن کے قیام کے وقت سنت نبوی کا ایک عکس اپنے دستور میں شامل کیا تھا۔ اصل سنت نبوی بیعت ہے' لیکن جب میں نے انجمن قائم کی تھی تو کہا تھا کہ میرا اصل مقصود انجمن قائم کرنا نہیں ہے بلکہ بیعت کی بنیاد پر اقامت دین کے لئے جماعت بنانا پیش نظر ہے۔ ایسی جماعت کا قیام تو اُس وقت ممکن نہ ہو سکا' لیکن انجمن کے دستور میں ایک شق رکھی گئی جس کے تحت صدر مؤسس کو ویٹو کا حق دیا گیا' اگرچہ وہ حق آج تک استعمال کرنے کی

نوبت نہیں آئی' لیکن اس کی برکت سے انجمن کا کام اللہ کے فضل و کرم سے ایسا چل رہا ہے کہ کبھی کوئی جھگڑا' دنگا' فساد نہیں ہوا بلکہ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لانا پڑتا ہے کہ آپ اس کی شوریٰ میں شامل ہو جائیں۔ یہ صرف سنت نبوی کے ایک حصے پر عمل کی برکت ہے۔ اگر حضور ﷺ کی زندگی کے مقصد "اظہار دین الحق" کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا جائے تو کیا کچھ برکات اور اللہ کی نصرتیں حاصل ہوں گی ؎

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں ' میں اسی لئے نمازی

اس کے علاوہ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ انجمن کے کاموں میں participation صرف چندہ دینا نہیں ہے' اگرچہ آج کل ملک کے معاشی حالات میں خرابی کے باعث اس کی بھی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ اس لئے اس کام کو مزید آگے بڑھائیے' انجمن کے کاموں میں دلچسپی لیجئے' مجالس میں شرکت کیجئے' تاکہ جانی یا مالی کسی قسم کے تعاون میں کسی مرحلے پر کمی محسوس نہ ہو۔

آج کے اجلاس میں پچھلی کارروائی پڑھی گئی' جس میں محسنین اور مؤسسین کا تذکرہ ہوا۔ ان حضرات کے بارے میں میرے دل میں ہوک اُٹھتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک عمارت جب بن کر تیار ہو جاتی ہے تو اس کی بنیاد زمین میں چھپ جاتی ہے' کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں ہے' کیسی ہے۔ ساڑھے چھبیس برس قبل صرف آٹھ افراد نے ایک دستاویز پر دستخط کئے تھے جن کے حوالے سے انجمن کی رجسٹریشن ہوئی تھی۔ اگرچہ مؤسسین کی تعداد بیس تھی جنہوں نے ابتدائی طور پر پانچ پانچ ہزار روپے پیش کئے تھے' لیکن انجمن کی رجسٹریشن آٹھ دستخطوں سے ہوئی تھی۔ ان میں ایک دستخط کرنے والا میں بھی ہوں اور جو بقیہ سات تھے اس وقت ان میں سے صرف ایک ساتھی خادم حسین صاحب یہاں موجود ہیں' باقی سات حضرات یہاں موجود نہیں ہیں۔ پھر یہ کہ جو بیس مؤسسین تھے ان میں سے کئی حضرات اس عالم فانی سے کوچ کر گئے ہیں' جیسے ڈاکٹر یقین کے والد شیخ محمد یٰسین صاحب' ساہیوال سے تعلق رکھنے والے شیخ منظور الحق صاحب اور لاہور سے تعلق رکھنے والے چوہدری نصیر احمد وِرک صاحب۔ میں یہ نام اس لئے لے رہا ہوں کہ آج ہم ان کے لئے دعائے مغفرت کریں اور ان کی یاد کو تازہ کریں۔ کیونکہ انہوں نے ابتدا میں اس

کام کے لئے وقت لگایا' محنت کی' کوشش کی۔ اس لئے آج ہم احسان مندی کے جذبے کے ساتھ ان کا قرض ادا کرتے ہوئے ان کے لئے دعا کریں۔ اسی طرح میرے چھوٹے بھائی اقتدار احمد مرحوم بھی مؤسسین میں سے تھے اور بہت فعال تھے۔ کراچی کے ڈاکٹر عبداللطیف خان بھی ہمارے مؤسسین میں شامل تھے۔

پھر ہمارے دو بزرگ حضرات ایسے ہیں جو بہت فعال رہے ہیں لیکن کچھ عمر کا تقاضا اور کچھ حوادث زمانہ کے اعتبار سے اب وہ بہر حال فعال نہیں ہیں' جن میں شیخ محمد عقیل صاحب کا دم غنیمت ہے کہ وہ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں' اِس وقت ان کی اہلیہ صاحبہ شدید علیل ہیں' ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے' اس کے اثرات بھی ان پر پڑ رہے ہیں' اس پر یہ مستزاد یہ کہ ان کی عمر بھی ۸۳ برس ہے۔ اگرچہ وہ انجمن کے تو "مؤسسین" میں سے ہیں لیکن میں ذاتی طور پر انہیں اپنے محسنین میں شمار کرتا ہوں۔ اس لئے کہ قرآن اکیڈمی کے لئے قطعہ زمین انہوں نے ہی ھبہ کیا تھا اور یہ زمین انہوں نے اس حال میں دی تھی کہ میں ان سے واقف بھی نہیں تھا۔ وہ خود مسجد خضریٰ کے اتوار اور جمعہ کے دروس میں آتے تھے۔ اس زمانے میں دو اڑھائی سو افراد ہوتے تھے' بعد میں تعداد بڑھتے بڑھتے درس مسجد شہداء میں منتقل ہوا تو تعداد پانچ سو ہو گئی۔ ایک مرتبہ گنتی ہوئی تو شرکاء کی تعداد سات سو تھی۔ اس لئے کہ ہم نے وہاں ایک کتابچہ تقسیم کیا تھا جس کے سات سو نسخے تقسیم ہوئے تھے۔ بہر حال اس زمانے میں جبکہ دو ڈھائی سو افراد آیا کرتے تھے' میں تو سب سے واقف نہیں تھا۔ جنرل ضیاء الحق صاحب بھی سویلین لباس میں آتے تھے جس کا مجھے بہت بعد میں علم ہوا۔ اس دوران شیخ عقیل صاحب نے ایک دفعہ مجھ سے کہا کہ آپ قرآن اکیڈمی کی بات کرتے ہیں تو میرا ایک قطعہ زمین ہے وہ میں دینا چاہتا ہوں۔ میں نے سمجھا کہ شاید کوئی وقتی سا جذبہ ان کے اندر ابھرا ہو گا' اس لئے میں نے کہا کہ اگلے اتوار کو دیکھ لیں گے' اس پر انہوں نے کہا اگر آپ چاہیں تو ابھی جا کر دیکھ لیں' میں نے کہا نہیں اگلے اتوار کو آپ کے ساتھ ضرور چلوں گا۔ وہ اگلے اتوار کو موجود تھے' چنانچہ میں ان کے ساتھ گیا اور ان کی پیشکش قبول کرنا پڑی۔ بہر حال ان کے لئے اور ان کی اہلیہ صاحبہ کے لئے (جو بیمار ہیں) دعا کی جائے۔

ملک محمد بشیر صاحب بھی ہمارے ایک اور فعال ساتھی رہے ہیں۔ ان کی عمر ۸۵ برس

(باقی صفحہ ۹۶ پر)